آبادی کی منصوبہ بندی

مغربی تہذیب کے غلبے کا کھیل

امجد عباسی

انسان کمزور ہے اور ناقص العلم بھی۔ وہ وحی الٰہی سے بے نیاز ہو کر اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو بے اعتدالی' فساد اور انتشار کا باعث بنتا ہے۔ یہی وہ چیلنج ہے جو قرآن نے یہ بانگ دہل دیا ہے کہ اسلام نے زندگی کے مسائل کے حل کے لیے جو نظام دیا ہے وہی صراط مستقیم اور مسائل کا مستقل اور منصفانہ حل ہے۔ اگر انسان کوئی نظام بنا کر دکھا سکتا ہے تو بنا لے' اس کے نتائج خود سامنے آجائیں گے۔ انسان نے اپنے زعم میں ہمیشہ ایسی جسارتیں کی ہیں۔ ہمارے عہد میں سرمایہ داری نظام اسی کا ایک شاخسانہ ہے' جس کی ناکامی کمیونزم اور اشتراکیت پر منتج ہوئی۔ انسانی "مساوات" کا یہ غیر فطری نظام محض ۷۰ سال میں اپنی موت آپ مر گیا۔ عقل والوں کے لیے اس میں نشانی ہے مگر ان کے لیے جو سمجھیں!

ایسی ہی ایک جسارت اقوام مغرب کا تحدید آبادی (آبادی کو کم کرنا) یا خاندانی منصوبہ بندی کا نظریہ ہے۔ اہل مغرب کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ افراط آبادی کے نتیجے میں وسائل کی قلت اور مسائل میں اضافے کا خدشہ ہے۔ مالتھس اور اس قبیل کے لوگوں نے بڑی جدوجہد اور تحقیق کے بعد اعداد و شمار کے ذریعے ایک ہولناک تصویر دنیا کے سامنے رکھ دی۔ دین و مذہب سے بیزار مغرب اور خدا ناآشنا تہذیب نے خدائی احکامات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنی خدائی کے تحت اس فلسفے کو پوری شدومد کے ساتھ نہ صرف پیش کیا بلکہ ایسے اقدامات کیے کہ خاندانی منصوبہ بندی مغربی تہذیب کا ایک شعار بن گئی۔ شرح پیدائش کم ہونے کے نتیجے میں مغرب کی آبادی تیزی سے کم ہونے لگی۔

آج مغرب اپنی تمام تر ترقی' بالادستی اور غلبے کے باوجود اپنی ہی حکمت عملی کا شکار ہوتا نظر آ رہا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے دور رس اثرات جو ظاہر بین نگاہوں سے قطعی طور پر نظر نہیں آ رہے تھے' اب

کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ مغرب کو اپنی کم شرح پیدائش کے نتیجے میں اب خدشہ لاحق ہو گیا ہے کہ دنیا کی دوسری اقوام اپنی کثرت آبادی کے نتیجے میں ان پر غالب آ سکتی ہیں جس کے نتیجے میں ۲۱ویں صدی میں دنیا میں حیرت انگیز جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں۔ اس حیرت انگیز تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ عالمی طاقتوں کو اس بات کا خدشہ ہے کہ آنے والے دنوں میں زیادہ آبادی اور زیادہ شرح پیدائش والے ممالک کی حیثیت کم آبادی اور کم شرح پیدائش والے ممالک کے مقابلے میں ثقافتی' نفسیاتی اور کئی دیگر حوالوں سے بہت مختلف ہو گی اور مجموعی طور پر انھیں سیاسی برتری حاصل ہو گی۔

بہ ظاہر یہ بات ناقابل فہم لگتی ہے کہ بڑا خاندان یا زیادہ آبادی والے ممالک مثلاً یوگنڈا' ماریطانیہ دنیا کے موجودہ ترقی یافتہ ممالک اور عالمی قوتوں پر غالب ہوں گے۔ دنیا کی موجودہ شرح پیدائش کو سامنے رکھتے ہوئے ایک اندازے کے مطابق اگر آج ایک یمنی خاتون کے ہاں سات بچے ہوتے ہیں اور آیندہ تین نسلوں تک یہی شرح پیدائش رہے تو ایک یمنی خاتون کے ۴۹ پوتے' ۳۴۳ پڑپوتے اور ڈھائی ہزار بچے اس سے اگلی نسل میں ہوں گے۔ دوسری طرف مغرب میں اوسطاً خاندان بمشکل ایک بچے پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے ایک یمنی خاتون کے مقابلے میں جرمنی' اسپین یا اٹلی کی ایک خاتون کے ہاں ایک بچہ ہو گا' ایک پوتا' ایک یا دو پڑپوتے اور غالباً دو یا تین بچے اگلی نسل میں ہوں گے۔ یہ یقیناً یمن' سعودی عرب' نائیجیریا' صومالیہ اور ایسے ہی دیگر ممالک کے مقابلے میں آبادی کے بہت نمایاں فرق کا باعث ہو گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کثیر آبادی کس طرح سے جغرافیائی اور سیاسی بالادستی کی حامل ہو سکتی ہے؟ بعض مغربی ماہرین نے اس حوالے سے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں اگر بڑھتی ہوئی آبادی کا یہی تناسب رہا تو آج کی عالمی طاقتیں اپنے تمام تر وسائل' قوت اور بالادستی کے باوجود اپنی کم آبادی کی وجہ سے بالآخر بے وزن ہو کر رہ جائیں گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغرب کی صنعتی ترقی کے لیے افرادی قوت اور خام مال کی فراہمی کا بڑا ذریعہ ترقی پذیر ممالک ہیں۔ جیسے جیسے ان ممالک کی افرادی قوت اور خام مال کی فراہمی کا تناسب بڑھتا جاتا ہے' اسی تناسب سے ان کی اقتصادی حالت بہتر ہوتی جاتی ہے اور اقتصادی توازن بتدریج ان کے حق میں بدلتا جاتا ہے۔ مثلاً لیما (پیرو) اور عمان (اردن) میں جہاں ۳۰ سال قبل ٹوٹی پھوٹی سڑکیں اور کچی آبادیاں نمایاں تھیں۔ آج آرام دہ کشادہ گھر' بڑی تعداد میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ قاہرہ پھیل کر نیویارک کے ہم پلہ ہو گیا ہے اور نمایاں طور پر ایک جدید شہر ہے۔ اسی طرح ایشیا کے دیگر شہر دیکھے جا سکتے ہیں۔

ہارورڈ یونی ورسٹی کی ۱۹۹۱ کی ایک تحقیق کے مطابق لاطینی امریکہ کی آبادی گذشتہ صدی کے آغاز کے مقابلے میں سات گنا زیادہ ہو چکی ہے اور فی کس آمدنی پانچ گنا بڑھ چکی ہے۔ یہ تحقیق مالتھس کے نظریہ آبادی کی بھی نفی کرتی ہے جس کے مطابق آبادی کے بڑھنے کے تناسب سے وسائل میں اضافہ نہیں ہوتا۔

یہ تحقیق امریکی فوج نے کروائی تھی۔ اس کا مقصد امریکی امداد کا جائزہ لینا نہیں تھا بلکہ اس کا بنیادی مقصد آنے والے خطرات کی نشان دہی کرنا تھا۔ رپورٹ کے مطابق: آبادی اور معاشی ترقی میں اضافے کا رجحان ایک عالمی فضا تیار کر سکتا ہے جو دفاعی نقطہ نظر سے اس سے زیادہ شدید ہو گی جس سے سرد جنگ کے زمانے میں مغرب کے اتحادیوں کو سامنا تھا۔

اگرچہ یہ مفروضہ ہے اور دنیا میں اس انداز میں جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیوں کے بہ ظاہر کوئی آثار نہیں ہیں لیکن مغربی ماہرین اور قیادت اس بدلتے ہوئے رجحان سے پوری طرح چوکنے ہیں۔ انھیں خدشہ ہے کہ اس کے نتیجے میں ان کا اقتدار چھن سکتا ہے اور وہ زوال کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس موضوع پر مغرب میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ نارتھ کارولینا سنٹر برائے تحقیق آبادی اور تحفظ کے ڈاکٹر سٹیفن ڈی مفرڈ نے اپنی کتاب: Population Growth Control: The Next Move is America's میں ۲۰ سال قبل ۱۹۷۷ میں شائع ہوئی تھی' واضح طور پر لکھا ہے کہ دنیا کی آبادی کی تحدید کے لیے غیر معمولی اقدامات کی ضرورت ہے "اب وسیع پیمانے پر مداخلت لازماً کرنا ہو گی کیونکہ ہماری بقا خطرے میں ہے" (our survival is at stake)۔

یہ وہ تشویش ہے جو مغرب کو دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی سے لاحق ہے۔ اگلی صدی کے آیندہ چند سال فیصلہ کن ہوں گے۔ تحدید آبادی کی کیا صورت ہو گی' اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ترقی پذیر ممالک اس پر کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں اور کس حد تک عالمی سیاست و جغرافیائی صورت حال پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

مغربی ماہرین اور اسکالر جن میں بنجمن فرینکلن' برٹ رینڈرسل' امریکی صدر تھیوڈر روز ولٹ وغیرہ شامل ہیں' سب کو یورپ کی گھٹتی ہوئی شرح پیدایش پر ابتدا ہی سے تشویش لاحق تھی۔ بنجمن فرینکلن نے ۱۷۵۱ میں مقامی لوگوں اور افریقہ کے کالوں کے مقابلے میں سفید فام لوگوں کی مجموعی طور پر گھٹتی ہوئی آبادی کے پیش نظر آبادی کو بڑھانے کے لیے خصوصی اقدامات پر زور دیا۔ امریکی صدر تھیوڈر روز ولٹ (۱۹۰۱-۱۹۰۹) کو مجموعی طور پر امریکی سفید فام آبادی کے مقابلے میں ایشیا' مشرقی یورپ' لاطینی امریکہ اور افریقہ کے باشندوں کی کثیر شرح پیدایش پر تشویش لاحق تھی۔ برطانوی فلاسفر برٹ رینڈرسل کی کتاب: Marriage and Morals' ۱۹۲۹ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی جس میں اس نے مشرقی یورپ میں تیزی سے گھٹتی ہوئی شرح پیدایش پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اگر شرح پیدایش میں اضافہ نہ کیا گیا تو ایک وقت آئے گا جب طاقت ور افواج کی حامل قوتوں کے مقابلے میں زیادہ شرح پیدایش کی حامل قومیں طاقت میں بڑھ جائیں گی اور یوں طاقت کا توازن بگڑ جائے گا۔ چنانچہ اس نے مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر شرح پیدایش بڑھانے کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات اٹھانے کے لیے بھرپور زور دیا۔

ان مغربی ماہرین کا بیسویں صدی کے نصف ہی میں خیال تھا کہ کم شرح پیدایش کی وجہ سے سفید فام آبادی پر بتدریج غیر سفید فام آبادی غالب آ جائے گی۔ آج اس بات کو ایک جدید اصطلاح differential fertility سے واضح کیا جا رہا ہے۔ یعنی ایسی صورت حال جب دو یا دو سے زیادہ طبقات آبادی واضح طور پر مختلف شرح پیدایش کے حامل ہوں تو اس سے مجموعی طور پر آبادی پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ ان اثرات کا جائزہ دو طریقوں سے لیا جا سکتا ہے۔ ایک طریقہ critical mass کا ہے جس میں جائزہ لیا جاتا ہے کہ ایک محدود مگر باصلاحیت گروہ کس طرح سے اکثریت پر اثرانداز ہو سکتا ہے۔ دوسرا طریقہ معاشی طور پر سرگرم آبادی (EAP) کا ہے جس کے تحت ۱۵ سال سے ۵۵ سال کی عمر کے افراد کے لحاظ سے جو عملاً ٹیکس کی ادایگی کے ذریعے معاشرے پر اثرانداز ہوتے ہیں' جائزہ لیا جاتا ہے۔

Critical Mass کے نظریے کی ایک بہترین مثال جنوبی افریقہ کی ہے۔ ۱۹۵۱ میں جب سفید فام حکومت افریقہ میں قائم کی گئی تو آبادی کا تناسب تین اور ایک کا تھا' یعنی تین سیاہ فام افراد کے مقابلے میں ایک سفید فام۔ ایک نسل گزرنے کے بعد یہ تناسب سات اور ایک کا ہو گیا۔ اس شرح پیدایش کو سامنے رکھتے ہوئے' ۱۹۸۰ کے ایک جائزے کے مطابق' ۲۱ویں صدی میں یہ فرق گیارہ اور ایک کا ہو جائے گا' یعنی گیارہ سیاہ فام کے مقابلے میں صرف ایک سفید فام۔ طویل المیعاد منصوبہ بندی کے موضوع پر امریکی فوج کی ایک کانفرنس کی رپورٹ کے مطابق جنوبی افریقہ کی حالیہ آزادی کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک اہم وجہ سیاہ فام آبادی کا اکثریت میں ہونا بھی تھا۔ جنوبی افریقہ کی سفید فام قیادت کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اکثریتی آبادی پر ان کے لیے حکمرانی کا وہ انداز اب کامیاب نہیں ہو سکتا جو ماضی میں تھا۔ چنانچہ انھوں نے آزادی دے کر اپنے مفادات کے تحفظ میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

آبادی کی اکثریت کس طرح سے جغرافیائی اور سیاسی طور پر اثرانداز ہوتی ہے' یہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ یہی تصور دیگر کئی ممالک کے حوالے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اسرائیل کی مثال لی جا سکتی ہے جہاں ایک یہودی خاندان کے مقابلے میں ایک عرب خاندان کے افراد کی تعداد میں نمایاں فرق ہے۔ اسی طرح لبنان کا مسئلہ ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی عیسائیوں کے مقابلے میں نمایاں فرق کی حامل ہے اور مسلمانوں کی شرح پیدایش بھی مقابلتاً زیادہ ہے۔

سی آئی اے کے سابق ڈپٹی ڈائریکٹر برائے انٹیلی جنس رے ایس کلائن (Ray. S. Cline) نے اس نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب: The Power of Nations in the 1990s, A Strategic Assessment میں لکھا ہے کہ اگر ایک بڑا خطہ زمین کثیر آبادی کا حامل ہو گا تو وہ فطری طور پر قوت کا حامل ہو گا اور ملکی پالیسیوں اور خارجہ امور پر اثرانداز ہو گا۔ گویا کثیر آبادی ملکی وسائل' طاقت کے توازن اور امور مملکت پر اثرانداز ہونے کی قوت رکھتی ہے۔

یہ نظریہ ۱۹۹۰ میں نمایاں طور پر ابھر کر اس وقت سامنے آیا جب نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ڈیموگرافکس پیرس کے جین کلائیڈے چیسنس (Jean Claude Chesnais) نے ایک فیچر کے ذریعے اس بات کو واضح کیا کہ آیندہ چند عشروں میں کثیر آبادی کی بنا پر دنیا میں واضح سیاسی و جغرافیائی تبدیلی آنے کے امکانات ہیں جس کے عمومی آثار نمایاں ہیں۔ آبادی کی بنیاد پر نئی طاقتیں ابھریں گی جب کہ پہلی طاقتیں اپنی آبادی میں کمی کی بنا پر زوال پذیر ہو جائیں گی۔

آبادی کس طرح سے اثرانداز ہو سکتی ہے' اس کا اندازہ ماہر اقتصادیات Milica Zarkovic کی کتاب: The Demographic Struggle for Power: Engineering in the Modern World (1997) سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے مطابق تین بنیادی اصول ہیں جو آبادی کی بنیاد پر وسائل اور طاقت کی منتقلی کا باعث بنتے ہیں۔

۱۔ ایک بڑے گروہ میں زیادہ اہلیت ہوتی ہے کہ وہ سیاسی دباؤ کے ذریعے قومی وسائل پر اثرانداز ہو سکے۔

۲۔ ایک بڑا گروہ پالیسی سازی پر بھی اثرانداز ہو سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک محدود حکمران گروہ کثیر آبادی کے حامل گروہ کے اثرات کی بنا پر ان کے مطالبات ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ زیادہ اثر و رسوخ اور وسائل کا حامل ہو جاتا ہے۔

۳۔ زیادہ آبادی زیادہ علاقائی وسائل و سہولیات سے مستفید ہوتی ہے۔ اگر ایک گروہ اپنی آبادی کی بنا پر کسی علاقے میں غالب ہے تو فطری طور پر انفراسٹرکچر کا بڑا حصہ اس پر مشتمل ہو گا۔ نتیجتاً وہ اپنے تناسب کی بنا پر دیگر سہولیات کے علاوہ معاشی وسائل کے بڑے حصے کا حق دار بن جاتا ہے۔

مصنف کے بقول یہ اصول خاص طور پر ان علاقوں میں لاگو ہوتے ہیں جہاں اکثریت اور اقلیت میں اقتصادی ناہمواری پائی جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ صورت حال مجموعی طور پر عالمی سطح پر پائی جاتی ہے۔

کثیر آبادی کے حوالے سے ایک اور پہلو فوجی برتری اور جدید ہتھیاروں کی تیاری کا بھی ہے۔ بلاشبہ کسی ملک کو اپنے حریف ملک پر ہتھیاروں اور فوجی قوت کی بنا پر برتری حاصل ہوتی ہے۔ ہتھیاروں کی تیاری اور فوج کی تربیت کے لیے یقیناً دفاعی بجٹ اور وسائل کا بڑا حصہ درکار ہوتا ہے۔ اگر ٹیکس دہندوں کا حلقہ وسیع ہو گا تو زیادہ وسائل اکٹھے ہوں گے۔ اس لیے وسیع آبادی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ مغرب کو اس بات پر تشویش ہے کہ ان کی شرح پیدائش بتدریج گرتی جا رہی ہے۔ پینٹاگون کی ۱۹۸۸ میں تحقیق کے مطابق یہ مستقبل میں امریکہ اور اس کے حلیفوں کی فوجی برتری پر کئی حوالوں سے اثرانداز ہو سکتی ہے۔ ایک طرف شرح پیدائش کی کمی کی بنا پر بھرتی کے لیے نوجوانوں کی کمی کا مسئلہ ہے تو دوسری طرف عمر رسیدہ افراد کا بڑھتا ہوا تناسب ہے جو کچھ کمانے کی پوزیشن میں تو نہیں البتہ پنشن اور دیگر سہولیات کی

صورت میں ملکی بجٹ پر ایک بوجھ ہیں' جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جدید ہتھیاروں کی تیاری خاصا مہنگا کام ہے جس کے لیے وافر وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آبادی میں اضافے کی شرح میں کمی' ۱۵ سے ۵۵ سال کی عمر کے افراد جو کہ ٹیکس دہندگان کا حلقہ ہے' ان کے تناسب میں کمی' اور بوڑھے افراد کے تناسب میں اضافے کی بنا پر بتدریج وسائل اور ٹیکس کے حصول کا تناسب کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کثیر آبادی والے ممالک میں ۱۵ سے ۵۵ سال کی عمر کے حامل افراد کا تناسب زیادہ ہونے کی بنا پر وسائل اور ٹیکس کے حصول کے امکانات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ پھر مہلک ہتھیاروں کا موجود ہونا تحفظ کی یقینی ضمانت بھی نہیں ہے۔ اسرائیل کے پاس ایٹم بم اور دیگر مہلک ہتھیار موجود ہیں لیکن وہ فلسطین کے ان نوجوانوں کے آگے بے بس ہے جو پتھروں اور ڈنڈوں سے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں' اس لیے کہ ایٹم بم چلانے کے نتیجے میں اسرائیل خود بھی اس کی لپیٹ میں آتا ہے۔ اگر کوئی نوجوان اپنے ساتھ بم باندھ کر حملہ آور ہو جائے تو اس کے سامنے جہاز اور ٹینک بے بس ہو جاتے ہیں اور وہ ان کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔

فوجی برتری پر آبادی کس طرح سے اثرانداز ہوتی ہے اس کی نشان دہی ایک کتاب: Population and World Power میں بڑے واضح طور پر کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۱ میں شائع ہوئی تھی جب سرد جنگ اپنے عروج پر تھی۔ مصنفین کیتھرین (Katherine) اور اے ایف کے آرگانسکی (AFK Organski) کے مطابق جدید مہلک ہتھیاروں کی تیاری کے لیے صنعت کی متحمل صرف ایک عظیم اور کثیر آبادی کی قوم ہی ہو سکتی ہے۔ صرف وہی قومی حکومت اس قسم کے ہتھیاروں کی متحمل ہو سکتی ہے جو کروڑوں ٹیکس دہندگان اور اربوں ڈالر سرمایے کی حامل ہو۔

اسی قسم کے خدشات سمنیول ہنٹنگٹن کے پیش نظر بھی تھے جب اس نے تہذیبوں کے تصادم (Clash of Civilisations) کا تصور پیش کیا تھا۔ اس نظریے میں بھی' زیادہ اہم بات تہذیبوں کا تصادم نہیں تھی بلکہ آبادی کا مسئلہ ہی تھا۔ اس کے خیال میں کسی گروہ کی عددی قوت یعنی افرادی قوت میں اضافے کے نتیجے میں دوسرے گروہوں پر سیاسی' معاشی اور سماجی دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ زیادہ اہم بات جس کو بیان کرتے ہوئے وہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہے' وہ یہ ہے کہ یہ عمل کم آبادی والے گروہوں پر فوجی دباؤ بڑھا دیتا ہے۔ یقیناً کم آبادی والے ممالک یورپ اور امریکہ ہی ہیں۔ ہنٹنگٹن کو اس بات کا بھی خدشہ ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی بالخصوص نوجوانوں کا بڑھتا ہوا تناسب' کسی انقلاب یا بڑی تبدیلی کا محرک ثابت نہ ہو' لہٰذا وہ زور دیتا ہے کہ اس کا سدباب بہرحال ہونا چاہیے۔

موجودہ صدی اختتام پذیر ہے۔ آج دنیا کا ہر پانچواں شخص مسلمان ہے۔ مجموعی طور پر مسلمان ایک ارب سے زیادہ ہیں' اور دنیا کی واحد سب سے بڑی آبادی ہیں۔ اسلام آج اس پوزیشن میں ہے کہ وسیع تر

آبادی اور وسائل کی بنا پر ایک وسیع تر بلاک قائم کر سکے۔ اگرچہ بہ ظاہر مسلمانوں میں اس کے دور دور تک آثار نظر نہیں آ رہے' تاہم برٹ رینڈرسل نے ۱۹۲۹ میں جو پیش گوئی کی تھی کہ عالمی طاقتیں دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک کی صورت حال کی بنا پر ہمیشہ غالب نہیں رہیں گی بلکہ ترقی پذیر ممالک اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر عالمی طاقت کا توازن بدل کر رکھ دیں گے' پوری ہوتی نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کے وسط سے ہی مغربی مفکرین و ماہرین نے آبادی کے تناسب کے حوالے سے جس تشویش کا اظہار کیا تھا اب وہ واضح طور پر سامنے آتی نظر آ رہی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں آبادی کے اس اضافے کے خلاف مغرب نے جو اقدامات اٹھانا شروع کیے تھے' اب وہ عالمی سطح پر فیصلہ کن مرحلے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ گویا یہ اپنی نوعیت کی منفرد جنگ ہے جس کے اثرات و نتائج اگلی صدی کے ابتدائی سالوں میں نمایاں طور پر سامنے آنے کے امکانات ہیں۔

یورپ بالخصوص امریکہ تحدید آبادی کے منصوبے پر ۱۹۴۰ کے عشرے سے ہی عمل پیرا ہے مگر یہ معاملہ خفیہ تھا' تاہم ۶۰ کے عشرے میں یہ بات کھل کر سامنے آ گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب جاپان امریکہ کے زیر تسلط تھا تو تحدید آبادی منصوبے پر فوری طور پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ اگرچہ امریکی حکومت نے اس کا کبھی کھلے طور پر اعتراف نہ کیا۔ مگر حقائق و شواہد کے مطابق ۱۹۴۰ کے عشرے میں دو معروف امریکی ماہرین آبادیات وارن تھامپسن (Warren Thompson) اور پی کے ویل پٹن (P.K. Whelpton) کو امریکی افواج کے کمانڈر ڈگلس میک آرتھر نے جاپان کی آبادی کے مسئلے پر مشورے کے لیے مدعو کیا۔ اس دوران اس وقت کے امریکی جرنیل ولیم ڈریپر نے جو بعد میں امریکی افواج کے انڈر سیکریٹری بنے' خصوصی طور پر جاپان کے آبادی کے مسئلے پر گفتگو کے لیے دورے کیے۔ یہ دونوں ماہرین آبادیات ۱۹۵۲ میں پاپولیشن کونسل کے تاسیسی اجلاس میں موجود تھے۔ ۱۹۵۸ میں جرنیل ڈریپر کو صدر آئزن ہاور نے اعلیٰ سطحی کمیٹی کا چیئرمین نامزد کیا کہ وہ دوسرے ملکوں کو دی جانے والی امریکی فوجی امداد کا جائزہ لیں۔ یہ وہ پہلا فرد ہے جس نے عوامی سطح پر اس بات کا اعتراف کیا کہ امریکہ ترقی پذیر ممالک کے تحدید آبادی منصوبوں میں براہ راست مالی معاونت کرتا ہے۔

اس طرح بتدریج مختلف ادارے اور تنظیمیں سامنے آتی گئیں جنھیں امریکہ آبادی کے کنٹرول کے لیے مالی امداد دیتا ہے۔ ۱۹۶۷ میں جب سان فرانسسکو کی ایشیا فاؤنڈیشن نے امریکی ایجنسی سی آئی اے کے ذریعے اپنے منصوبوں کو جاری رکھنے کے لیے امریکہ سے فنڈ مانگا تو انکشاف ہوا کہ یہ ادارہ امریکی امداد کے ذریعے امریکی منصوبوں کے لیے کام کرتا ہے۔ ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت ایشیا فاؤنڈیشن کو پہلی مرتبہ باقاعدہ یو ایس ایڈ کے تحت مالی امداد دی گئی۔ اس مرتبہ یہ امداد امریکی بجٹ کی ترقیاتی امداد کی مد سے دی گئی۔ اس سے یہ بات واضح طور پر سامنے آ گئی کہ امریکہ ترقی پذیر ممالک میں اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے

ایک عرصے سے کام کر رہا تھا۔ اس سے قبل بھی یہ ادارہ "کمیٹی فار فری ایشیا" کے نام سے ۱۹۵۱ سے مشرق بعید میں کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لیے کام کر رہا تھا۔ بعد میں اس کا نام ایشیا فاؤنڈیشن رکھ دیا گیا۔ اس ادارے کو ایک درجن سے زیادہ ترقی پذیر ممالک میں امریکی منصوبوں بالخصوص خاندانی منصوبہ بندی کے لیے کام کرنے کے لیے فنڈ دیا گیا۔ یہ بات ۱۹۶۷ میں یو ایس ایڈ کی باقاعدہ رپورٹ سے منکشف ہو کر سامنے آئی۔

صرف ایشیا فاؤنڈیشن ہی سی آئی اے سے فنڈ وصول نہیں کرتی تھی بلکہ اور بھی کئی اداروں کی خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے مالی امداد کی جاتی تھی۔ ان میں The Pathfinder Fund بھی شامل تھا جو کہ Pathfinder International کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس بات کا انکشاف ۱۹۹۵ میں چھپنے والی ایک کتاب: They Will Be Done: Nelson Rockefeller and Evangelism in the Age of Oil میں کیا گیا جس میں لاطینی امریکہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے منصوبوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ایک اور ادارہ جس کا براہ راست سی آئی اے سے معاہدہ ہے وہ افریقی امریکہ انسٹی ٹیوٹ ہے جو سی آئی اے کے تعاون سے ۱۹۵۴ میں قائم کیا گیا تھا۔ پاپولیشن کونسل جو راک فیلر فیملی کے تعاون سے ۱۹۵۲ میں قائم کی گئی تھی' اس کے ابتدائی افسران و ذمہ داران کا بھی کسی نہ کسی انداز سے ان ایجنسیوں سے تعلق تھا جو خاندانی منصوبہ بندی کے لیے کام کر رہی تھیں۔ یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ یہ مختلف ادارے سی آئی اے کے آبادی کی تحدید کے براہ راست منصوبوں سے قبل کم از کم ایک عشرہ پہلے سے دنیا کی آبادی کو کم کرنے کے لیے کام کر رہے تھے۔

مغرب کے آبادی کی منصوبہ بندی کی ترغیب کے لیے کھل کر کام کرنے کے نتیجے میں فطری طور پر ردعمل سامنے آیا۔ چین کے انقلابی رہنما ماوزے تنگ نے ۱۹۴۹ میں' اپنے اقتدار سنبھالے سے دو ہفتے قبل خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت کرتے ہوئے واضح طور پر اپنے ایک بیان میں کہا کہ: یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ چین کثیر آبادی کا حامل ہے۔ مغرب کے شرح پیدائش کو کم کرنے کے دباؤ کو رد کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ دنیا کی تمام اشیا میں سے انسان سب سے قیمتی شے ہیں..... کثرت آبادی اور مصنوعات کی بے پناہ دولت کے ساتھ ایک عظیم چین ابھر کر سامنے آئے گا جہاں بھرپور زندگی اور ثقافت پروان چڑھے گی۔ مایوسی پر مبنی تمام نظریات بے بنیاد ہیں۔ ماؤ کے ان افکار کی بنیاد پر اخبارات و جرائد نے مغرب کے اس تصور کو انتقامی' انسانیت دشمنی اور چینیوں کو خون بہائے بغیر قتل کرنے کے مترادف ٹھہرایا۔

خود مغربی مفکرین نے مغرب کی آبادی کی تحدید کی اس مہم کو عالمی پیمانے پر چلانے پر اپنی تشویش کا اظہار کیا اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس کے خلاف فطری ردعمل سامنے آئے گا اور مغرب کے خلاف نفرت کی ایک فضا بن جائے گی۔ فرانسیسی ماہر آبادیات الفریڈ سووے (Alfred Sauvy) ان میں سے ایک

ہیں جنھوں نے ۵۰ سال قبل اس طرف نشان دہی کی تھی۔

ڈاکٹر آلان گٹ میچر (Dr. Alan Ghttmacher) نے جو پاپولیشن کونسل کے اساسی ارکان سے تھے' ۳۰ سال قبل ایک انٹرویو میں مشورہ دیا تھا کہ: اگر آپ آبادی کم (curb) کرنا چاہتے ہیں تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کام کو "کم بخت امریکی" (damned yankee) کے بجائے اقوام متحدہ کے ذریعے کیا جائے کیونکہ پھر یہ نسل کشی نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر امریکہ کسی سیاہ فام یا زرد فام کو کہتا ہے کہ شرح پیدایش کم کرو تو فوری طور پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں درپردہ سفید فام کو دنیا میں غالب کرنے کا محرک پوشیدہ ہے۔ اگر آپ اقوام متحدہ کی کثیر رنگ فوج کسی صورت میں بھجوا سکتے ہیں تو آپ بہت بہتر نتیجہ حاصل کر سکیں گے۔

۱۹۶۵ وہ سال ہے جب امریکہ کے آبادی کے پروگرام میں ایک واضح تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ اس سال کانگرس نے بیرونی امداد بجٹ سے کچھ رقم خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے فروغ کے لیے مختص کی۔ اس مد میں رقم کا تناسب ہر سال نمایاں طور پر بڑھتا چلا گیا۔ نومبر ۱۹۶۷ میں جب کہ یو ایس ایڈ پاپولیشن پروگرام ابھی ابتدائی مراحل میں تھا' ایک حکم (directive) جاری کیا گیا جس میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کو صحیح خطوط پر آگے بڑھانے کے علاوہ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ اس پروگرام کو بالخصوص ان لوگوں میں مقبول بنانا ہے جو خاندانی منصوبہ بندی میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ۱۹۷۶ میں یو ایس ایڈ کے ریویو پینل برائے ایشیا فاؤنڈیشن کی رپورٹ میں واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ایشیا فاؤنڈیشن جب سی آئی اے کے لیے کام کر رہی تھی تو خاندانی منصوبہ بندی اس کے ایجنڈے کا ایک حصہ تھا۔ رپورٹ کے مطابق فاؤنڈیشن کا اہم ترین مقصد بیرون ایشیا سے ایسے نئے تصورات کو متعارف کروانا تھا' جو سماجی ڈھانچے اور معاشرتی طاقتوں کو متاثر کر سکتے ہوں۔

اس مقصد کے لیے فاؤنڈیشن مختلف مقامی تنظیموں سے مل کر' انفرادی اور اجتماعی سطح پر' ایشیائی لوگوں میں خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق معلومات اور مختلف طریقوں کو عام کرنے کے لیے کام کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایشیائی ممالک کی قیادت پر بھی اثرانداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ممالک میں اس پروگرام میں ان سے تعاون کریں۔ مختلف پروگرام' مطالعاتی دورے' پرائیویٹ ریڈیو اور ٹیلی وژن' ہر طرح کا لٹریچر' اشتہارات' سلائیڈز اور دیگر ذرائع ابلاغ کو فاؤنڈیشن اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی ہے۔ اس کے علاوہ خاندانی منصوبہ بندی کے لیے گولیاں اور دیگر اشیا کی عام فراہمی بھی ان کے مقاصد میں شامل ہے۔ یہ ادارہ ایسے تحقیقی منصوبوں کو بھی امداد فراہم کرتا ہے جن کا مقصد خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کے فروغ پر تحقیق کرنا ہوتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج امریکی باشندوں کے ٹیکس کا ایک بڑا حصہ آبادی کی تحدید کے عالمی پروگرام

کی نذر ہو رہا ہے۔ واشنگٹن کی بیورو کریسی کی زبان میں اسے طلب پیدا کرنے والا (demand generating) پروگرام کہا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت عالمی سطح پر مختلف حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

ایک' یہ کہ امداد کا بڑا حصہ خاندانی منصوبہ بندی کے پروپیگنڈے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ ممالک جہاں خاندانی منصوبہ بندی کے مغربی طریقوں کو شرم ناک سمجھا جاتا ہے اور مذہبی یا روایتی طور پر ان کی مخالفت پائی جاتی ہے' خفیہ طور پر ریڈیو اور ٹیلی وژن سے تعاون کیا جائے۔ مختلف پروگراموں میں ایسی شخصیات کو پیش کیا جاتا ہے جو خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں رائے عامہ ہموار کر سکیں۔ کھلے عام پروپیگنڈے کے نتیجے میں شدید ردعمل سامنے آنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ یہ طریقہ موثر ابلاغ کی حکمت عملی کے حوالے سے اپنایا جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ مقامی تنظیموں کا قیام اور ان کے ذریعے اہداف کا حصول ہے جسے constituency building کہا جاتا ہے۔ ان تنظیموں کی یو ایس ایڈ کے تحت اور دیگر غیر ملکی ذرائع سے امداد کی جاتی ہے۔ ان تنظیموں کا مقصد خاندانی منصوبہ بندی مراکز چلانا' اور قانونی تبدیلیوں کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔ یہ بنیادی طور پر مغربی ممالک اور ان کے ٹھیکے داروں کے نمایندوں کا کردار ادا کرتی ہیں۔ اس طرح سے خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام اور مغربی ممالک جو اس کی پشت پناہی کرتے ہیں' براہ راست تنقید سے بچ جاتے ہیں۔ یوں بالواسطہ اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔

تیسرا طریقہ پالیسی اختیار کرنے (policy development) کا ہے جس کے تحت سربراہان مملکت اور وزارتوں پر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ شرح آبادی کو کم کرنے کے لیے پالیسی اپنائیں اور اقدامات اٹھائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے عام طور پر ترقی پذیر ممالک پر قرضوں یا مخصوص امداد کا حصول' یا قرضوں اور سود میں رعایت جیسے حربے بطور دباؤ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب ایک ملک ان شرائط کو تسلیم کر لیتا ہے تو پھر خاندانی منصوبہ بندی کا یہ پروگرام سرکاری سرپرستی میں چلنے لگتا ہے۔ پھر یہ موقف اپنایا جاتا ہے کہ متعلقہ ممالک نے خاندانی منصوبہ بندی کے لیے ان سے تعاون کی درخواست کی ہے۔

عالمی سطح پر آبادی کی تحدید کا پروگرام اس وقت تک محض ایک نظریہ ہی تھا جب تک یو ایس ایڈ کے تحت اسے مالی معاونت فراہم نہیں کی گئی۔ ابتدا میں جنوب کے علاقوں میں تحدید آبادی کے پروگرام کے لیے بجٹ سے ایک ملین ڈالر مختص کیے گئے۔ ۱۹۸۰ تک پانچ ارب ڈالر سالانہ اس پروگرام کے لیے مختص کیے گئے۔ امداد کی فراہمی کا ایک ذریعہ یورپی ممالک' ایجنسیاں اور بڑا ذریعہ امریکی کنٹرول کے تحت عالمی بنک ہے' جب کہ ان اعداد و شمار میں امریکی کارپوریشنوں اور فاؤنڈیشنوں کے اربوں ڈالر شامل نہیں ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی آبادی کو کم کرنے کے لیے مغرب کتنا وافر سرمایہ کھپا رہا ہے۔

جنوری ۱۹۹۱ میں راک فیلر پاپولیشن کونسل نے ایک پریس ریلیز جاری کیا جس کے مطابق anti-natalist مہم کے تحت ترقی پذیر ممالک میں ۴۰۰ ملین سے زائد بچوں کی پیدائش روکنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کے اندازے کے مطابق اگلی صدی کے اختتام تک ترقی پذیر دنیا کی آبادی ۲.۲ ارب تک کم ہو جائے گی۔ دوسری طرف کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ ایسا ممکن ہونا مشکل ہے اس لیے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ردعمل بھی سامنے آ رہا ہے۔ امریکہ میں خارجہ پالیسی بنانے والے افراد میں سے کچھ کو امریکہ کے آبادی کی تحدید اور ابھرنے والی طاقتوں کے نئے بلاک کی تعمیر کے روکنے کے پروگرام میں غیر معمولی کردار پر تشویش ہے۔ ان کے خیال میں امریکہ کی مکمل عالمی بالادستی اور واحد طاقت ہونے کے خدشے سے نئی طاقتوں کے ظہور پذیر ہونے کا عمل غیر معمولی طور پر تیز تر ہو سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ۵۰ سال قبل ماہر آبادیات الفریڈ سووے نے عالمی سطح پر آبادی کی تحدید کے پروگرام پر مغرب کے خلاف جس عالمی ردعمل کے خدشے کا اظہار کیا تھا' وہ پیش گوئی پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔ آج دنیا کے ۹۸ فی صد بچے ایشیا' افریقہ' عالم عرب اور لاطینی امریکہ میں پیدا ہو رہے ہیں۔ اس بات کا انکشاف یو ایس ایڈ کے تحت ایک ایجنسی نے دو سال قبل ایک پریس ریلیز میں کیا تھا۔ یہ اعداد و شمار دنیا کے بدلتے ہوئے توازن کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔

اہل مغرب نے دنیا پر غلبے کے لیے تحدید آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے درحقیقت اسلام کو مغلوب کرنے کے لیے جو چال چلی تھی وہ آج انھی کے لیے وبال جان بن گئی ہے۔ آج مسلمان دنیا کی سب سے بڑی آبادی اور ایک عالمی جغرافیائی بلاک بنانے کی پوزیشن میں ہیں۔ مغرب کے مقابلے میں مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ جذبہ جہاد آج ایک حقیقت ہے۔ کل کے مقابلے میں آج کئی نئے محاذوں پر مسلمان مصروف جہاد ہیں اور اپنی جان و مال کی قربانیوں سے اپنے عزائم و ولولوں کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ اسلامی تحریکیں عالمی سطح پر اپنا وجود تسلیم کروا رہی ہیں اور متبادل قیادت کے لیے آگے بڑھتی نظر آتی ہیں' جب کہ مغرب کا سحر ٹوٹتا اور غلبہ مٹتا نظر آتا ہے۔

آج جہاں آبادی کی تحدید اور خاندانی منصوبہ بندی کا نظریہ مجموعی طور پر اپنے نتائج کے لحاظ سے ناکامی سے دوچار ہے' وہاں یہ اسلام کی حقانیت کی بھی ایک دلیل ہے کہ خدا ہی وہ ہستی ہے جو کائنات کا نظام چلا رہی ہے' اور وہی ایک ذات ہے جو نقائص سے پاک اور صحیح نظام زندگی انسانیت کو عطا کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ہی وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے (ماخوذ: امپیکٹ' لندن' جولائی ۱۹۹۹)۔